(۴۳)

فرمودہ ۱۰ اگست ۱۹۵۴ء بمقام ناصرآباد (سندھ)

یہ عید ہمیں اس بات کا سبق دیتی ہے کہ کس طرح قربانیوں سے قومیں بنتی ہیں اور کس طرح عیاشیوں سے قومیں مرتی ہیں۔ جس طرح موت ایک ایسی چیز ہے جو ہر انسان پر آتی ہے مگر پھر بھی لوگ اسے یاد نہیں رکھتے۔ اسی طرح قومی تباہی بھی ایسی چیز ہے جو ہر قوم پر آتی ہے مگر پھر بھی کوئی قوم اسے یاد نہیں رکھتی۔ یہ ایسا سبق ہے جسے آجتک کبھی کسی نے یاد نہیں رکھا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے بھیڑوں میں سے جب اگلی بھیڑ کوئی کام کرے تو دوسری بھیڑ بھی وہی کام کرنے لگتی ہے جو پہلی نے کیا ہوتا ہے۔ اگر آگے گڑھا ہو اور پہلی بھیڑ اس میں گر جائے تو دوسری بھی اس میں گرتی ہے اور تیسری بھی اس میں گرتی ہے۔ یہانتک کہ چرواہا انہیں ہٹائے تو وہ ہٹتی ہیں ورنہ اس میں گرتی چلی جاتی ہیں۔ علم حیوانات کے ماہرین نے ایک دفعہ تجربہ کرکے دیکھا ہے کہ بھیڑوں کے گلّے کے آگے دو آدمی ایک رسّی پکڑ کر بیٹھ گئے اور گیارہ انچ انہوں نے رسّی کو اونچا رکھا جب بھیڑیں وہاں پہنچیں تو پہلے پہلی بھیڑ کودی پھر دوسری کودی اور اس کے بعد تیسری کودی۔ دو تین بھیڑوں کے کودنے کے بعد انہوں نے رسّی ہٹالی مگر ہزار بھیڑ اسی طرح کودتی چلی گئی۔ جب بھی کوئی بھیڑ وہاں پہنچتی تو وہ کود کر اس جگہ سے گزرتی، گویا اپنے خیال کے نتیجہ میں وہ ایسی اندھی ہوجاتی ہیں کہ دیکھتی نہیں کہ واقعہ کیا ہے۔ یہی حال قوموں کا نظر آتا ہے جب کوئی قوم غریب ہوتی ہے ناتوان ہوتی ہے، کمزور ہوتی ہے اور اس کے افراد دولت مند قوموں کو دیکھتے ہیں کہ انہوں نے بڑے بڑے محلات بنائے ہوئے ہیں، بڑے بڑے تکلفات کے سامان ان میں موجود ہیں آٹھ آٹھ دس دس نوکر ایک ایک شخص کے ہیں، انہوں نے وردیاں پہنی ہوئی ہیں، پیٹیاں باندھی ہوئی ہیں اور جب وہ گھر کے دروازہ پر پہنچتا ہے تو وہ اسے سلام کرکے بڑی عزت سے بٹھاتے اور اس کی خدمت کے لئے آگے پیچھے دوڑتے ہیں تو بجائے یہ خیال کرنے کے کہ یہ قوم تباہی کی طرف جارہی ہے۔ دیکھنے والا دیکھتا ہے تو کہتا ہے۔ کہ اگر مجھے دولت ملی تو مَیں بھی اسی طرح کرونگا۔ وہ دیکھتا نہیں کہ یہ اس قوم کی موت کی علامت ہے جب قومیں مرنے لگتی ہیں تو اسی طرح کرتی ہیں اور اگر وہ اس طرح نہ کریں تو مریں کیوں۔ مگر بجائے اس کے کہ وہ توبہ کرے اور کہے کہ یہ مرنے لگے ہیں اور خدا کا شکر کرے کہ اب ان کی گدی پر بیٹھنے کے لئے میری باری آئی ہے وہ انہی کی نقل کرنے کا ارادہ کرلیتا ہے اور اس طرح خود بھی تباہ ہوجاتا ہے پہلے انگریز آئے تو دائسرائے

تک کی تنخواہ ہزار روپیہ ہوئی مگر اب ڈپٹی کمشنر کی تنخواہ تین ہزار روپیہ ہو گئی تھی۔ اسی طرح انگلستان سے جو سپاہی آئے ان کو صرف تین روپے ہفتہ کے ملتے تھے یعنی بارہ روپے ماہوار۔ ہمارے ہندوستانی سپاہی کی تنخواہ بعد میں اس سے زیادہ ہو گئی تھی یعنی آج سے پندرہ سولہ سال پہلے اسے اٹھارہ روپے ماہوار ملتے تھے۔ مگر وہ چھ ہزار میل سے اپنا وطن چھوڑ کر آتا اور اسے تین روپے ایک ہفتہ کے ملتے اور وہ بھی یکمشت نہیں بلکہ ایک روپیہ ہفتہ وار ملتا۔ اور دو روپے سرکاری خزانہ میں جمع رکھے جاتے اور کہا جاتا کہ یہ روپیہ اس لئے جمع کیا جا رہا ہے تاکہ جب تم واپس جاؤ تو اپنے بیوی بچوں کے لئے لے جاؤ۔ مگر اس وقت ساری دنیا میں انگریز پھیلتے چلے جاتے تھے۔ ان میں دلیری بھی تھی، طاقت بھی تھی، ہمت بھی تھی۔ مگر جب دولت آئی اور ترقہ پیدا ہوا تو ان کی تنخواہیں بڑھنی شروع ہوئیں اور یا تو پہلے انگریز گھوڑے پر سوار ہو کر سارا سارا دن دھوپ میں پھرتا رہتا تھا اور اس کے ماتحت اسے کہتے تھے کہ صاحب کچھ آرام بھی کر لیجئے اور یا پھر ڈاک بنگلے بن گئے جن میں وہ اترا کرتے۔ اب سارا دن پنکھے چل رہے ہیں۔ برفیں آ رہی ہیں۔ شرابیں پی جا رہی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں ہمت نہ رہی اور ہندوستانیوں نے انگریزوں کو پکڑ کر نکال دیا۔ گاندھی جی نے اعلان کیا تھا کہ اگر تم ساری ہندوستانی اکٹھے ہو جاؤ تو تم ان لوگوں کو جبراً یہاں سے نکال سکتے ہو اور سمندر سے پرے دھکیل سکتے ہو۔ لوگوں نے سمجھا کہ گاندھی جی کوئی معجزہ دکھانے لگے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی گاندھی جی اپنے ملک کے لوگوں کے متعلق تو سمجھتے ہی تھے کہ وہ غافل اور سست ہیں لیکن وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ انگریز مر چکے ہیں اور اب انکی لاش کو پھینکنا کوئی مشکل کام نہیں۔ رستم کی لاش بھی اسی طرح اٹھا کر پھینکی جا سکتی ہے جس طرح ایک کتے کی لاش۔ گاندھی جی کی ذہانت اور ہوشیاری یہ تھی کہ وہ یہ سمجھ چکے تھے کہ انگریز اب مر چکا ہے۔ اور نیم جان ہندوستانی بھی اسے اٹھا کر پرے پھینک سکتے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو انگریز کو ہندوستان نے ہی اٹھا کر نہیں پھینکا، سیلون نے بھی اسے پھینکا، برما نے بھی اسے پھینکا، مصر نے بھی اسے پھینکا، ایران نے بھی اسے پھینکا، عراق نے بھی اسے پھینکا، غرض تمام ممالک کے لوگوں نے اسے اپنے اپنے ملک سے نکال دیا۔ آخر سمٹ سمٹا کر وہ انگلستان میں محدود ہو کر رہ جائیں گے۔ اور پھر کچھ مدت کے بعد ممکن ہے ان کی ایسی ہی حالت ہو جائے جیسے ابتدا میں تھی کہ چمڑے کے تہہ بند باندھا کرتے تھے اور ننگے جسم رہا کرتے تھے یا اگر یہ زمانہ نہ آئے تو اس کے قریب قریب ان کی حالت پہنچ جائے۔ گاندھی جی کی عقلمندی یہ نہیں تھی کہ انہوں نے ہندوستانیوں کو زندہ کیا۔ ان کی عقلمندی یہ تھی کہ انہوں نے دیکھ لیا کہ انگریز مر چکا ہے۔ اور اب ذرا سے اتحاد کی ضرورت ہے اگر ہندوستانی اکٹھے ہو جائیں تو وہ ان کو بڑی آسانی

سے نکال سکتے ہیں مگر اس کے مقابلہ میں اب ہم دوسری طرف دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یورپ کے پاس دولت ہے۔ مگر روس کے پاس دولت نہیں اور اس نے لوگوں میں یہ شور مچایا ہوا ہے کہ ہم ساری دنیا کو کھانا دیں گے اور وہ لوگ جو بھوکے مرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اگر روس کو حلہ ملے تو ہمیں کھانے کے لئے روٹی میسر آجائیگی۔ حالانکہ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ روسی نظام میں کوئی برتری ہے وہ غلطی کرتے ہیں۔ اگر روس کو دنیا میں نفوذ کا موقع مل جائے تو وہ بھی وہی کچھ کرے گا جو انگریز کرتے رہے ہیں۔ اور اسی طرح اس نے دنیا کی دولت سے فائدہ اٹھانا ہے جس طرح انگریز فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ غرض ایک قوم کے بعد دوسری قوم مرتی چلی جاتی ہے مگر وہ عبرت حاصل نہیں کرتی۔ جب ایک قوم کے بعد دوسری قوم کی باری آتی ہے تو اس کے افراد بھی جانتے ہیں کہ ہم اسی طرح ناچیں اسی طرح گائیں اسی طرح شرابیں پئیں جس طرح پہلی قوم کیا کرتی تھی۔ پھر خدا اسے تباہ کر دیتا ہے۔ اور کسی اور قوم کو بھیج دیتا ہے غرض انسانوں کی موت پر ان کو قبروں میں دفن کیا جاتا ہے۔ انسانوں کی موت کی علامت یہ ہوتی ہے کہ تیز بخار ہو گیا یا تیز کھانسی ہو گئی یا انتڑیوں میں سے خون آنے لگ گیا یا شدید پیچش ہو گئی۔ اور قوموں کی موت کی علامت یہ ہوتی ہے۔ کہ ان کے پاس دولت بہت ہوتی ہے۔ مگر ان کو اس دولت کے خرچ کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا۔ وہ اسے زیادہ سے زیادہ اپنی ذات پر خرچ کرتے ہیں، اچھے سے اچھا کھانا کھاتے ہیں، اچھے سے اچھا لباس پہنتے ہیں۔ اچھے سے اچھے مکانات میں رہتے ہیں۔ اچھے سے اچھا فرش رکھتے ہیں اور رات دن ترفہ اور آرام طلبی میں بسر کرتے ہیں، محنت کی عادت ان میں نہیں رہتی یہ ساری علامتیں اس کی موت کی ہوتی ہیں جس طرح انسانی جسم کی حرارت معلوم کرنے کے لئے تھرمامیٹر ہوتا ہے۔ اسی طرح قوم کی زندگی اور اس کی موت کی گھڑیاں معلوم کرنے کا یہ تھرمامیٹر ہوتا ہے جب تم دیکھو کہ کسی قوم میں ترفہ پیدا ہو گیا ہے۔ اور کام کی عادت اس میں نہیں رہی تو سمجھو کہ اس کا پارہ حرارت بہت بڑھ گیا ہے۔ اور وہ موت کے قریب پہنچ گئی ہے۔

عیدالاضحیہ ہمیں یہی سبق سکھاتی ہے کہ قومی زندگی قربانیوں کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا بیٹا خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ایک جنگل میں جا کر رکھ دیا تھا یہاں ناصر آباد میں اگر تمہارا لڑکا ذرا بڑا ہو جائے اور وہ ابتدائی تعلیم حاصل کرلے تو تم کہتے ہو ہم اسے کنری بھجوائیں گے۔ کنری والوں سے پوچھو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے لڑکوں کو میرپور خاص بھجوائیں گے۔ میرپور خاص والوں سے پوچھو تو وہ کہتے ہیں ہم اپنے لڑکوں کو کراچی بھجوائیں گے۔ کراچی والوں سے پوچھو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے لڑکوں کو انگلینڈ بھجوائیں گے غرض تم اوپر کی طرف جاتے ہو لیکن ابراہیم جہاں رہتے تھے گو وہ بھی ایک چھوٹا سا قصبہ تھا مگر انہوں نے اپنے بیٹے کو

اس جگہ سے بھی نکال کر وہاں جا کر رکھا جو ایک وادیٔ غیر ذی زرع تھی۔ جہاں نہ کھانے کا کوئی سامان تھا نہ پینے کا کوئی سامان تھا تاکہ اس میں محنت کی عادت پیدا ہو۔ کام کی عادت پیدا ہو قربانی کی عادت پیدا ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ابراہیمؑ کا اپنے بیٹے کو اس طرح ایک جنگل میں جا کر چھوڑ دینا گو ظاہر میں اسے اپنے ہاتھوں سے ذبح کرنا تھا مگر فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ۔ ہم نے اسمٰعیلؑ کا فدیہ ایک بہت بڑی قربانی کے ذریعہ سے دیدیا۔ بعض لوگ غلطی سے اس کے یہ معنے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسمٰعیلؑ کے بدلے ایک مینڈھا قربان کروا دیا۔ حالانکہ یہاں ذبح عظیم کے الفاظ ہیں جس کے معنے ہیں بہت بڑی قربانی اور مراد یہ ہے کہ دنیا میں جو بڑی بڑی قومیں سمجھی جاتی تھیں ہم نے ان کو ابراہیمؑ کی نسل پر قربان کر دیا۔ بڑے لوگ تختوں پر بیٹھتے ہیں مگر وہ قوم جو بھوکی رہنے کی عادی ہو جب اس کے غلبہ کا وقت آتا ہے تو وہ بڑی بڑی حکومتوں کا تختہ الٹ دیتی ہے۔ یہ ایک پیشگوئی تھی جو حقیقی معنوں میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں پوری ہوئی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کو قربان کرنا چاہا اور اس نے ایک ایسی جگہ اسے بھیجا کہ جہاں نہ کھانا تھا نہ پانی اور جہاں اس کے زندہ رہنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ہم نے اس کی اس قربانی کو دیکھا اور کہا کہ اب اس کے بدلہ میں ایک بہت بڑی قربانی پیش کی جائیگی چنانچہ دیکھ لو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں جو اسماعیلؑ کی نسل میں سے تھے کس طرح عرب نکلے اور انہوں نے قیصر و کسریٰ کو کاٹ کر رکھ دیا۔ گویا بجائے اس کے کہ اسمٰعیلؑ کی نسل بھوکی مرتی اس نے بڑی بڑی دولتوں اور شانوں والی حکومتوں کو تباہ کر دیا۔ قومی ترقی درحقیقت ٹڈی دل کی طرح ہوتی ہے۔ جس طرح ٹڈیاں جنگلوں میں پلتی ہیں۔ اور جب ان کی غذا ختم ہو جاتی ہے تو وہ اڑتی ہیں اور بڑے بڑے سرسبز و شاداب کھیتوں کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہیں اسی طرح جو قومیں صحیح اصول پر چلنے والی ہوتی ہیں وہ غربت سے گذارے کرتی ہیں محنت اور قربانی سے کام لیتی ہیں۔ مگر جب لوگ پھر بھی ان کو جینے نہیں دیتے اور انہیں مارنے کے لئے اٹھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کا عذاب ظلم کرنے والوں پر نازل ہوتا ہے۔ اور وہ غریب اور کمزور سمجھے جانے والے دنیا پر غالب آجاتے ہیں۔ جب عرب کے لشکر نے ایران پر حملہ کیا تو ایران کے بادشاہ نے اس خبر کو سنکر کہا کہ یہ جھوٹی خبر ہے میں کس طرح مان لوں۔ کہ وہ عرب جس میں ہمارے دس سپاہی بھی جاتے تو سارے ملک کو آگے لگا لیتے تھے۔ اس نے ہم پر حملہ کر دیا ہے۔ لوگوں نے کہا۔ خبر درست ہے واقعہ میں ہم پر حملہ ہو چکا ہے۔ اس نے کہا۔ اچھا ان کے چند لیڈر بلواؤ۔ تاکہ میں ان سے خود بات کروں اور پوچھوں کہ آخر ان کا مقصد کیا ہے۔ چنانچہ وہ گئے اور صحابہؓ نے ایک وفد تیار کر کے بادشاہ کی ملاقات کیلئے بھجوا دیا۔ جب صحابہؓ کا وفد پہنچا تو بادشاہ نے کہا۔ میں نے سنا ہے کہ تم لوگوں

نے میرے ملک پر حملہ کر دیا ہے۔میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ تم میں یہ جرأت کس طرح پیدا ہوئی۔تم وہ ہو جو ٹڈیاں کھایا کرتے تھے، نہ تمہارا کھانا اچھا تھا نہ پینا اچھا تھا، نہ تمہارا لباس اچھا تھا۔ تم ننگے پھرتے تھے، اخلاق تم میں تھے ہی نہیں، ماؤں سے تم نکاح کر لیتے تھے۔تمہیں کیا سوجھا کہ تم حملہ کے لئے آ گئے اگر تم پر غربت کا بہت ہی دور آ گیا ہے تو میں تم میں سے ہر افسر کو دو دو اشرفی اور ہر سپاہی کو ایک ایک اشرفی دینے کے لئے تیار ہوں۔ تم روپیہ لو اور واپس چلے جاؤ اس زمانہ میں گو روپیہ کی بڑی قیمت تھی مگر پھر بھی پتہ لگتا ہے کہ اس کی نگاہ میں عربوں کی کیا حیثیت تھی عرب کا جو لشکر ایران پر حملہ آور ہو رہا تھا اس کی حیثیت ایران کے بادشاہ کے نزدیک یہ تھی کہ وہ سمجھتا تھا کہ اگر میں ان کو پندرہ پندرہ روپے دے دوں تو یہ واپس جانے کے لئے تیار ہو جائیں گے اب پینتالیس روپے ماہوار اور راشن سپاہی کو ملتا ہے مگر وہ سمجھتا تھا کہ اگر میں انہیں صرف پندرہ پندرہ روپے بھی دیدوں گا تو یہ واپس چلے جائیں گے اور کہیں گے کہ اچھا اب ہم چلتے ہیں۔ تو ایران کے بادشاہ کے نزدیک عربوں کی حیثیت اتنی ہی تھی مگر جو اس وفد کے سردار تھے انہوں نے کہا تم جو کچھ کہتے ہو ٹھیک ہے ہم ایسے ہی تھے۔ٹڈیاں کھاتے تھے، مردار کھاتے تھے، ماؤں سے نکاح کر لیا کرتے تھے مگر اب اللہ تعالٰے نے ہم میں اپنا رسول بھیج دیا ہے جس کی وجہ سے ہماری حالت بدل چکی ہے اور ہم خدا تعالٰے کے وعدوں کے مطابق تمہارے ملک پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ بادشاہ کو غصہ آیا، اس نے درباریوں کو حکم دیا کہ مٹی کا ایک بورا لاؤ اور اس کے سر پر رکھ دو۔ باقی صحابہؓ کو غصہ آیا کہ یہ ہمارے امیر کی ہتک کرتا ہے مگر وہ ہنس پڑا۔ اور اس نے کہا انہیں مٹی کا بورا میرے سر پر رکھنے دو۔جب انہوں نے مٹی کا بورا اس کے سر پر رکھ دیا۔ تو وہ دربار سے بھاگے اور انہوں نے بلند آواز سے کہا کہ بادشاہ نے ایران کی زمین اپنے ہاتھ سے ہمارے سپرد کر دی ہے۔مشرک بڑا وہمی ہوتا ہے، اب تھا تو یہ ایک لطیفہ مگر وہ گھبرا گیا اور اس نے سمجھا کہ یہ تو بڑی بدشگونی ہوئی چنانچہ اس نے حکم دیا کہ دوڑو اور ان کو پکڑ کر واپس لاؤ۔ مگر عرب لوگ گھوڑے کی سواری کے بڑے مشاق ہوتے ہیں۔ وہ دربار سے نکلے تو انہوں نے اپنی گھوڑوں کو ایڑیاں لگائیں اور وہ کہیں سے کہیں نکل گئے۔[۵] یہ کیفیتیں تھیں صحابہؓ کی، دنیا حیران تھی کہ یہ لوگ کہاں سے آ گئے۔ جس طرح ٹڈی آتی ہے تو اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ کوئی روس کے میدانوں سے آتی ہے، کوئی چین کے میدانوں سے آتی ہے، کوئی عرب کے میدانوں سے آتی ہے اور وہ سارے علاقہ پر چھا جاتی ہے۔ اتنا چھوٹا سا جانور ہوتا ہے مگر اس کے مقابلہ میں لوگ عاجز آ جاتے ہیں اور پھر اس کی نسل میں خدا تعالٰے نے اتنی بڑھوتی رکھی ہے کہ جہاں بیٹھی اور اس نے انڈے دیئے۔ وہیں اگلے سال پھر ٹڈی پیدا ہو جاتی ہے اور فصلوں کو تباہ کر دیتی ہے۔یہی علامت بڑھنے والی قوموں کی ہوتی ہے۔

لوگوں کا ایک ایک بچہ ہوتا ہے تو ان کے آٹھ آٹھ ہوتے ہیں۔ غرض قوموں کی ترقی کا راز صرف قربانیوں میں ہے۔ مگر بہت سے لوگ اپنی کم ہمتی کی وجہ سے پہلے قدم پر ہی گر جاتے ہیں اور ان کی حالت بالکل ایسی ہی ہو جاتی ہے جیسے کسی شاعرؔ نے کہا ہے کہ

"اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے"

لیکن جو لوگ قربانیوں کے معیار کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں وہ اس زمانہ کو دیکھتے ہیں جس میں ان کی قربانیوں کا بدلہ ان کو ملتا ہے۔ ایران کے بادشاہ نے صحابہؓ کو صرف ایک ایک پونڈ دینا چاہا مگر جو صحابہؓ کو ملا اس کے مقابلہ میں بھلا پونڈ کی کیا حیثیت تھی۔

حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کے متعلق آتا ہے کہ جب وہ فوت ہوئے تو باوجود اس کے کہ وہ اس قدر صدقہ و خیرات کرنے والے تھے کہ سارے عرب میں مشہور تھے پھر بھی ان کے ورثاء کو لاکھوں روپیہ ملا۔ تو اللہ تعالیٰ غلبہ کے موقعہ پر قوموں کو بہت کچھ دیتا ہے لیکن اصل سوال یہ ہوتا ہے کہ اس وقت بھی اس کی عادت میں یہ بات داخل ہو کہ اپنے نفس پر خرچ کرنے کی بجائے وہ اس روپیہ کو دین پر خرچ کرے، غرباء پر خرچ کرے، صدقہ و خیرات میں دے۔ یہ تو بے شک شریعت کہتی ہے کہ جب تمہیں دولت ملے تو تمہارے جسم اور چہرہ پر بھی اس کے کچھ آثار ہونے چاہئیں مگر وہ کچھ آثار ہی کہتی ہے یہ نہیں کہتی کہ ساری دولت اپنے نفس کے لئے خرچ کرنی شروع کر دو اور اچھے کھانے اور اچھے پینے میں مشغول ہو جاؤ۔ لیکن بیوقوف اور نادان انسان اس وقت کے آنے سے پہلے بہک جاتا ہے اور اس کی مثال ویسی ہی ہو جاتی ہے جیسے ہمارے ملک میں مشہور ہے کہ "چھکتے جٹ کٹوری لبھی پی پی پانی آپھریا"

بھلا ایک کٹوری کی بادشاہوں کی دولتوں کے مقابلہ میں کیا حیثیت ہے۔ مگر وہ صرف کٹوری ملنے پر ہی اتنا مغرور ہو جاتا ہے کہ کبھی اس گھر میں جاتا ہے اور یہ دکھانے کے لئے کہ اس کے پاس کٹوری ہے وہ ان کے گھڑے سے پانی پینے لگ جاتا ہے کبھی دوسرے گھر میں جاتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے پیاس لگی ہے اور یہ بتانے کے لئے کہ اس کے پاس کٹوری ہے وہ اس میں ان کے سامنے پانی پیتا ہے جو قوم اتنے بڑے وعدوں کے ہوتے ہوئے ایران کے بادشاہ کے پونڈ یا ایک کٹوری پر مرنے لگتی ہے اس کے متعلق کیا امید کی جا سکتی ہے کہ وہ بڑھے گی۔ وہی قوم بڑھتی ہے جو خدا تعالیٰ کے وعدوں کو اپنے سامنے رکھتی ہے جو سمجھتی ہے کہ ہم نے اخلاق اور روحانیت کے ساتھ دنیا کو فتح کرنا ہے اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں وہ ویسی ہی قربانی بھی کرتے ہیں اور ویسی ہی محنت بھی کرتے ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جب نیا نیا دعویٰ فرمایا تو مولوی برہان الدین صاحب

رضی اللہ عنہ جو اہلِ حدیث میں سے تھے اور ان کے لیڈر تھے انہوں نے بھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر سُنا۔ شاید انہوں نے براہین کا اشتہار پڑھا یا آریوں اور عیسائیوں کے خلاف کسی اخبار میں آپ کا مضمون دیکھا تو ان کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں خود انہیں جا کر دیکھ آؤں۔ چنانچہ وہ قادیان پہنچے مگر ان دنوں حضرت مسیح موعود علیہ السلام قادیان میں نہیں تھے بلکہ کہیں باہر تشریف لے گئے تھے۔ غالباً یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام چلّہ کے لئے ہوشیارپور تشریف لے گئے تھے وہ قادیان سے ہوشیارپور پہنچے مگر وہاں پہنچکر انہیں معلوم ہوا کہ آپ سے ملاقات نہیں ہوسکتی کیونکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے ساتھ والوں کو ہدایت دے دی تھی کہ کسی کو اندر نہیں آنے دینا اور شیخ حامد علی صاحبؓ کو دروازہ پر بٹھایا ہوا تھا کہ وہ نگرانی رکھیں اور کسی کو اندر نہ آنے دیں۔ یہ وہاں پہنچے اور انہوں نے منتیں کیں کہ مجھے ملنے دو مگر انہوں نے نہیں مانا آخر مولوی برہان الدین صاحبؓ نے کہا کہ مجھے صرف چق اُٹھا کر ایک دفعہ دیکھ لینے دو۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کروں گا۔ لیکن حامد علی صاحبؓ نے یہ بات بھی نہ مانی مگر اللہ تعالیٰ نے چونکہ ان کی خواہش کو پورا کرنا تھا اس لئے اتفاق ایسا ہوا کہ ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کوئی ضرورت پیش آئی اور آپ نے فرمایا میاں حامد علی! تم فلاں چیز لے آؤ۔ وہ اس طرف چلے گئے اور انہیں موقع میسر آگیا۔ یہ چوری چوری گئے اور انہوں نے چق اٹھا کر حضرت صاحب کو دیکھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس وقت کچھ لکھ رہے تھے اور جلدی جلدی کمرہ میں ٹہل رہے تھے۔ یہ عام انسان کی نظر میں بہت معمولی بات ہے مگر صاحبِ عرفان کی نگاہ میں یہ بڑی بات تھی۔ انہوں نے آپ کو دیکھا اور واپس آگئے لوگوں نے آپ سے پوچھا مولوی صاحب آپ نے کیا دیکھا۔ انہوں نے کہا۔ اس نے بہت دور جانا ہے یہ کمرے میں بھی تیز تیز چل رہا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بڑا کام کرنا ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"۔ جس نے جینا ہوتا ہے اس میں جینے کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اور جس نے مرنا ہوتا ہے اس میں مرنے کے آثار پائے جاتے ہیں۔ انگریز بھی یہی سمجھتے تھے کہ ان کو کون نکال سکتا ہے۔ فرانسیسی بھی یہی سمجھتے تھے کہ ان کو انڈوچائنا سے کون نکال سکتا ہے۔ کسی زمانہ میں ہسپانیہ والے بھی یہی سمجھتے تھے کہ ان کو ہسپانیہ سے کون نکال سکتا ہے۔ مسلمان بھی یہی سمجھتے تھے کہ ان کو ہندوستان اور چین وغیرہ سے کون نکال سکتا ہے مگر آخر نکل گئے۔ یہ موت ہے جو ایک کے بعد دوسری قوم پر آئی اور کسی قوم نے پہلی قوم سے عبرت حاصل نہیں کی۔ انفرادی موت سے بچا نہیں جا سکتا۔ لیکن قوم کی موت سے بچا جا سکتا ہے اگر وہ زندہ رہنے کی کوشش کرے۔ مگر آج تک کسی قوم نے یہ کوشش نہیں کی جو بھی آتا ہے وہ فوراً زہر کھانا شروع کر دیتا ہے۔ اور موت کو قبول کر لیتا ہے۔"

(الفضل ۵ جولائی ۱۹۵۷ء)

۱؎ ۔ موہن داس کرم چند گاندھی (۱۸۶۹ - ۱۹۴۸ء) ہندوؤں کے مشہور رہنما اور ہندوستان کی آزادی کے اوّلین معمار تھے۔ "مہاتما" کہلاتے اور "عدم تشدد" کا پرچار کیا کرتے تھے۔

۲؎ ۔ (i) TH EPIC OF MHN. P. 139. Published by TIME-LIFE International (Nederland) 1963.
(ii) "LOOKING AT HISTORY" Britain from cavemen to the present day. by R.J. unstead. P. 24

۳؎ ابراہیم ۱۴ : ۳۸ ۴؎ الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۸

۵؎ ۔ تاریخ کامل ابن اثیر ۴۵۶/۲ ، تاریخ طبری ۴۹۰/۳ ، البدایہ والنہایہ ابن کثیر ۲۱/۷

۶؎ دیوانِ غالب صفحہ ۱۵ مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور۔

۷؎ ۔ اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ جلد ۳ صفحہ ۳۱۷

۸؎ ۔ اس سے کسی کی کم ظرفی اور کمینگی کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے (فرہنگ آصفیہ جلد اوّل صفحہ ۲۰۹ زیر لفظ اوچھا)

۹؎ ۔ حضرت مولوی برہان الدین صاحب رضی اللہ عنہ (۱۸۳۰ - ۱۹۰۵ء) حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے جلیل القدر صحابی تھے ۱۸۹۲ء میں بیعت کی۔ اس سے قبل اہل حدیث کے پرجوش مبلغ تھے قبولِ احمدیت کے بعد ایمان اور اخلاص میں اتنی ترقی کی کہ عند اللہ احمدیت کے شہتیر ٹھہرے۔ (تاریخ احمدیت ۲۱۵/۳)

۱۰؎ ۔ حضرت حافظ شیخ حامد علی صاحب رضی اللہ عنہ (وفات ۱۹۱۹ء) حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے قدیم صحابہ اور مخلص خدام میں سے تھے۔ ان کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ اصحاب احمد جلد ۱۳

۱۱؎ ۔ حضور رضی اللہ عنہ کی اپنی روایت ہی کافی ہے۔ اس کیلئے کسی حوالہ کی ضرورت نہیں

۱۲؎ ۔ فرہنگ آصفیہ جلد چہارم صفحہ ۱۷۶